© rasailojaraid.com

وَقَدْ كَانُوْا يُخَالِطُوْنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَتَرِدُ رُسُلُهُمْ وَوُفُوْدُهُمْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَدْخُلُوْنَ مَسْجِدَهٗ وَلَمْ يَأْمُرْ بِغَسْلِ شَيْءٍ مِّمَّا اَصَابَتْهُ اَبْدَانُهُمْ

خلاصہ یہ کہ سورہ توبہ کی بحولہ بالا آیت میں نجاست سے مراد مشرکین کے عقیدہ کی معنوی نجاست مراد ہے۔ ان کے بدن کی ظاہری نجاست نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ مسلمانوں سے ملتے جلتے، اور ان کی مساجد (آیت اترنے کے بعد مسجد حرام میں نہیں) میں آتے جاتے تھے اور آپ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کبھی ان اشیاء کو دھونے کا حکم دیا ہو جن سے مشرکوں کے اجسام مس کرتے اور لگتے تھے۔

اس مؤثر دلیل کے پیش نظر درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ مشرک کے جوٹھے کو بھی شرعاً پاک سمجھا جائے، البتہ تعارض ادلہ کے پیش نظر اسے مکروہ جانتے ہوئے اس سے اجتناب کو افضل قرار دیا جائے۔

۳۔ ماکول اللحم جانور کا جوٹھا

ماکول اللحم جانور وہ ہے جس کا گوشت کھانا حلال و جائز ہو۔ ایسا جانور یا پرندہ طاہر و طیب ہے اور اس کا جوٹھا پاک ہے۔ ابن حزمؒ لکھتے ہیں: [1]

كُلُّ حَلَالٍ فَهُوَ طَيِّبٌ وَالطَّيِّبُ لَا يَكُوْنُ نَجِسًا

ہر حلال جانور طیب و پاکیزہ ہے اور اس لحاظ سے وہ خود یا اس کا جوٹھا نجس نہیں۔

۴۔ دیگر جانوروں اور پرندوں کا جوٹھا

جن جانوروں کا گوشت کھانا حلال نہیں۔ ان کا جوٹھا بھی (باستثنائے کلب و خنزیر) پاک ہے۔ خواہ وہ جنگلی درندے ہوں یا گدھے اور خچر کی قسم کے جانور اور خواہ مختلف قسم کے پرندے۔ یہ بھی دراصل دین و شریعت کی وسعت و آسانی کا ایک ثبوت ہے۔

اگر کسی مسافر کا گزر ایسے جوہڑ وغیرہ پر سے ہو جہاں سے جنگلی درندے پانی پیتے ہوں تو وہ ضرورت پڑنے پر بلا تامل اس سے وضو وغیرہ کر سکتا ہے۔ حدیث میں ہے [2]

لَهَا مَا حَمَلَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَنَا مَا

درندہ وغیرہ جو پی جائیں، پی جائیں، بقایا پینے

---

[1] المحلی ۱: ۱۲۹ [2] رواہ الدار قطنی عن ابن عمر ... البیہقی و الموطا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بَقِیَ شَرَابٌ وَّطَهُوْرٌ — اور دھونے کے کام آسکتا ہے

امام ابو حنیفہؒ نے درندوں اور گدھے وغیرہ کے جوٹھے پانی کے متعلق عدم طہارت کا فتوے دیا ہے مگر حدیث کی روشنی میں وہ معتبر نہیں۔

بلیؒ کا جوٹھا بھی انہیں جانوروں کے جوٹھے سے ملحق اور پاک ہے۔ ویسے اس کے متعلق الگ حدیثؒ بھی ہے جس میں ایک صحابی کا بلی کے جوٹھے پانی سے وضو کرنا مذکور ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے

اِنَّهَا لَیْسَتْ بِنَجَسٍ — بلی نجس جانور نہیں ہے۔

۵۔ خنزیر اور کتا

اب تک جو بھی اشیاء کی جو اقسام بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب پاک اور مطہر ہیں۔ مگر سؤر اور کتے کا جوٹھا ناپاک ہے۔ قرآن وحدیث کی معروف تصریحات کے پیش نظر سؤر کا جوٹھا پاک نہ ہونے پر تو اتفاق ہے مگر ایک روایت کے مطابقؒ امام مالکؒ نے کتے کے جوٹھے کے ناپاک ہونے سے اختلاف کیا ہے۔ تاہم یہ اختلاف معتبر نہیں۔ کیوں کہ حدیثؒ میں ہے:

اِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِیْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَلْیَغْسِلْهُ سَبْعًا — اگر کتا کسی برتن سے پیے تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہیے۔

"سات مرتبہ" کی قید پر بحث تو آئندہ انشاء اللہ "تطہیر نجاسات" کے ضمن میں آئے گی۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ دھونے کے حکم میں اس تاکید ومبالغہ سے ظاہر ہوا کہ کتے کا جوٹھا ناپاک ہے۔

اعتذار

محترم قارئین کرام! دیگر مضامین کی وجہ سے **روس میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے؟** کی قسط اس دفعہ شامل اشاعت نہیں کی جاسکی۔ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(ادارہ)

ا۔ المحلی ۱: ۱۲۹ ۲۔ صحیحین وغیرہ عن کبشہ بنت کعب ۳۔ نیل الاوطار ۱: ۴۶ ۴۔ صحیحین عن ابی ہریرہؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ

دوامِ حدیث

قرآن و حدیث دونوں یقینی ہیں

جب یقین اور ظن کا معنی واضح ہو گیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ کسی کے متعلق یہ کہنا کہ یقینی ہے، اس کے تین معنی ہوتے ہیں:

۱۔ اس کا ثبوت یقینی ہے کیونکہ متواتر ہے یا اس پر اجماع ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی۔

۲۔ اس کا مفہوم یقینی طور پر بیہی ہے کیونکہ یہ محکم ہے یا مفسر ہے صرف نص یا ظاہر یا مؤول یا خفی یا مجمل یا مشکل یا متشابہ نہیں۔

۳۔ اس کا مضمون یقینی ہے کیونکہ بدیہی ہے یا اس پر برہان موجود ہے۔

تو اب اس دعویٰ (کہ دین یقینی ہونا چاہیے، ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی) کو سمجھنا آسان ہو گیا کیوں کہ اس جگہ یقینی سے مراد اگر یہ ہو کہ اس کا ثبوت یقینی ہونا چاہیے تو پھر مندرجہ ذیل باتوں میں غور کرنا چاہیے:

۱۔ قرآن مجید کی تبلیغ کرنے کا حق ایک آدمی کو نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس قدر آدمی ہونے چاہییں جن سے تواتر متحقق ہو جاتے کیونکہ تواتر کے بغیر جو خبر ہو گی وہ ظنی ہو گی۔ اور ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی۔

۲۔ کسی اخبار یا پرچے میں ایک آدمی کے مضمون کو دین سمجھ کر شائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک آدمی کی خبر ظنی ہوتی ہے اور ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی بلکہ اس قدر آدمی ہونے چاہییں جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔

۳۔ پھر تبلیغ میں ایک آدمی کا ترجمہ معتبر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک کی بات ظنی ہوتی ہے اور ظنی امر دین نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ پھر لغت میں ایک آدمی کی شہادت قبول نہیں ہونی چاہیے جب عموماً اہل لغت ایک ایک آدمی کی شہادت لے لیتے ہیں کیونکہ یہ چیز ظنی ہوگی اور ظنی چیز دین نہیں ہوتی۔

۵۔ اگر حدیثیں اس لیے دین نہیں کہ ظنی ہیں تو جو حدیثیں یقینی ہیں ان کو دین ماننا چاہیے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل قسم کی حدیثیں یقینی ہیں۔

۱۔ جو لفظاً متواتر ہیں کیونکہ متواتر میں عدد معین کی شرط صحیح نہیں بلکہ جس عدد سے علم حاصل ہو وہ تواتر کے لیے کافی ہے اور راویوں کے عالی صفات گنتی کے قائم مقام ہو جاتے ہیں بلکہ بہت سی صفات گنتی سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:

"میں نے علوم الحدیث اور شرح نخبۃ الفکر میں اس شخص کا رد کیا ہے جو کہتا ہے کہ متواتر کی مثال صرف حدیث (مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا الخ) یعنی جو مجھ پر عمداً جھوٹ بولے اور میں نے بیان کیا ہے کہ متواتر کی مثالیں بہت ہیں:

(۱) من بنى لله مسجدا الخ (جو اللہ کے لیے مسجد بنائے (ب) موزے پر مسح کرنے کی حدیث (ج) رفع یدین کی حدیث (د) شفاعت کی حدیث (ہ) حوض کی حدیث (و) آخرت میں اللہ کے دیدار کی حدیث (ز) اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (امام قریش سے ہوں گے)[۱]"

۲۔ وہ حدیثیں جو معنیً متواتر ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے فرمایا ہے کہ:

"طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، خرید و فروخت، نکاح اور غزوات کے احکام میں بہت سی حدیثیں معنیً متواتر ہیں[۲]"

۳۔ وہ حدیثیں جن پر امت کا اجماع ہے اور اس قسم کی حدیثیں بے شمار ہیں۔

۴۔ وہ حدیثیں جن کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے جیسے بخاری، مسلم کی وہ حدیثیں جن پر بعد میں کسی محدث نے تنقید نہیں کی۔

ان چار قسم کی حدیثوں کو بسبب یقینی ہونے کے دین سمجھنا چاہیے۔

اگر دین کے یقینی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ:

★ دین وہ کلام ہوگا جس کا مدلول یقینی ہو تو اس صورت میں قرآن و حدیث دونوں برابر ہیں۔

---

[۱] فتح الباری، ج ۱، صفحہ ۱۰۴ [۲] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

★ اگر حدیث کے بعض کلمات کی دلالت ظنی ہے تو اس طرح قرآن کے بعض کلمات کی دلالت بھی ظنی ہے

★ اگر قرآن کے بعض کلمات کی دلالت یقینی ہے تو حدیث کے بعض کلمات کی دلالت بھی یقینی ہے۔

چنانچہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر دین کے یقینی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ:

★ اس کا مضمون یقینی ہے تو اس مسئلہ میں قرآن و حدیث دونوں برابر ہیں متکلمین دونوں کو یقینی کہتے ہیں اور منطقی کسی کو بھی یقینی نہیں کہتے نہ قرآن کو اور نہ حدیث کو بلکہ دونوں کو مقبولات میں داخل کرتے ہیں اور مقبولات ظنی ہوتی ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کسی امر کا دین ہونا اس امر کے منافی نہیں کہ وہ تاریخ بھی ہو۔

★ قرآن مجید باوجود اس کے کہ دین ہے تاریخ پر بھی مشتمل ہے۔ اس طرح احادیث دین بھی ہیں اور دین کی ابتدائی تاریخ بھی ہے جیسے قرآن مجید میں دین پر عمل کرنے والوں اور منکروں کا مفصل بیان ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا ذکر ہے۔ جیسے قرآن میں احکام ہیں ایسے احادیث میں بھی احکام ہیں۔

اگرچہ دین کے یقینی اور ظنی ہونے کی بحث ایک حد تک مکمل ہو چکی ہے مگر پھر بھی ناظرین کی تسلی کے لیے ان دلائل کی حقیقت بھی کھول کر بیان کرنا ضروری ہے جو بعض منکرین حدیث نے بیان کیے ہیں۔

دین کے یقینی ہونے کے دلائل

(۱) وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ [1] ترجمہ: اور ان میں سے اکثر ظن ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

کسی خبر کے متعلق یہ کہنا کہ یہ یقینی ہے اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں:

- اس کا ثبوت یقینی ہے۔
- اس کی دلالت یقینی ہے۔

---

[1] سورہ یونس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۔ اس کا مضمون یقینی ہے (واقعہ کے اعتبار سے)

اس آیت میں حق اور ظن کا اطلاق تیسرے معنے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی شرک حق نہیں بلکہ ظنی چیز ہے۔ واقعہ کے خلاف ہے اور ظن کا اطلاق چونکہ یہاں حق کے مقابلہ میں ہے اس لیے اس مقام پر ظن کا معنی جھوٹ اور باطل کا ہے اور حق کا معنی واقعہ کے موافق ہونے کا ہے۔

فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ ظن بہت جھوٹی بات ہے۔

حق اور صدق کا معنی ایک ہی ہے یعنی سچی اور پکی بات اور ظن کے معنے ہوئے جھوٹی اور کچی بات۔ اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مشرک اپنے دین میں کسی حجت اور دلیل کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اپنے آباء و اجداد کے پیچھے بلے سوچے سمجھے جا رہے ہیں۔

زمخشری نے یہ معنیٰ ہے کہ اللہ پر جو ایمان کا دعوے کرتے ہیں وہ علم کے درجے کا نہیں بلکہ ظن کے درجہ میں ہے۔ اعتقادات میں دلائل قطعیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور باقی عملی احکام میں دلائل ظنیہ (منطقی معنے کے اعتبار) سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اس صورت میں ظن سے منطقی معنیٰ مراد لینا پڑے گا۔ مگر ظن کی مذمت کا تعلق محل خاص کی وجہ سے ہو گا یعنی اعتقادی امور میں یقین کی ضرورت ہے ظن کافی نہیں اور قرائن وہ اولہ ہوں گے جو ظنی دلائل کے واجب العمل ہونے پر دلالت کرتے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ صحیح بات یہ ہے کہ اس آیت میں صرف اس امر کا ذکر ہے کہ دین میں پکی اور سچی بات ہونی چاہیے اور پکی اور سچی ہونے کے مراتب ہوتے ہیں۔

اعتقادات میں اعلیٰ درجہ درکار ہے اور عملیات میں ادنیٰ درجہ بھی کافی ہے اور دونوں مرتبوں کو ظن مذموم نہیں کہہ سکتے بلکہ ظن مذموم شک وہم، جھوٹ کے معنے میں ہے۔ منطقی معنے کے ساتھ کسی شیئ کا ظنی ہونا اس کے حق ہونے کے منافی نہیں۔ ہاں اعتقادات میں چونکہ قطعی دلائل درکار ہوتے ہیں اس لیے وہاں (معنی منطقی) ظنی دلیل کا استعمال بھی قابل مذمت ہے۔

یہ تقریر ان متکلمین کے مذہب پر ہے جن کے نزدیک دلائل نقلیہ سے بھی یقین حاصل ہو سکتا ہے یعنی جب دلائل نقلیہ ثبوت و دلالت اور مضمون کے اعتبار سے یقینی ہوں تو ان سے عقیدہ کا اثبات ہو سکتا ہے خواہ وہ دلائل قرآن میں ہوں یا احادیث میں کیونکہ بہت سی احادیث بھی ثبوت و دلالت اور مضمون کی حیثیت کے اعتبار سے یقینی ہیں اور جو دلائل بلحاظ ثبوت یا دلالت یا مضمون کی صداقت کے اعتبار سے یقینی نہ ہوں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا مگر ان پر عمل کرنا واجب ہے اور اس قسم کے دلائل قرآن و حدیث دونوں میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید اگرچہ مضمون کی حقیقت کے اعتبار سے یقینی ہے جیسے وہ احادیث جن کا ہم نے ذکر کیا ہے مگر دلالت کے اعتبار سے سارا قرآن یقینی نہیں بلکہ بعض احادیث کی طرح ظنی ہے۔ ہاں ثبوت کے لحاظ سے سارا قرآن اور احادیث کا اکثر حصہ بھی یقینی ہے مگر قرآن اگر خبرِ واحد کے ذریعہ کسی کو پہنچے تو اس وقت اس کا ثبوت ظنی ہو گا ظنی چیز پر عمل واجب ہوتا ہے مگر جو متکلمین یہ کہتے ہیں کہ ادلہ نقلیہ سے یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظن ہی حاصل ہوتا ہے۔ معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کا یہی مسلک ہے، ان کے قول کے مطابق یقین سے مراد تصدیق کا وہی مرتبہ مراد لینا پڑے گا جو ادلہ نقلیہ سے حاصل ہوتا ہے اور ظن اس سے کم مرتبہ (جو شک، وہم اور جھوٹ کی صورت میں ہوتا ہے) مراد لینا پڑے گا۔ اس معنی کے اعتبار سے سب احادیث صحیحہ یقینی ہوں گی نہ ظنی۔

معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کے نزدیک ان عقائد میں جن پر شریعت موقوف ہے دلائل عقلیہ سے کام لیا جاتا ہے۔ دلائل نقلیہ وہاں کارآمد نہیں۔ پس اس صورت میں آیت مذکورہ میں عقائد کے معاملہ میں دلائلِ عقلیہ مراد ہوں گے یعنی مشرکین کے پاس کوئی ٹھوس عقلی دلیل نہیں بلکہ کچی باتیں ہیں جن کو خرص و تخمین و ظن اور جھوٹ کہا جاتا ہے اگر کوئی ٹھوس دلیل علم کی بات ہو تو پیش کریں۔

بہرکیف آیت میں حق سے مراد مضمون کا نفس الامر کے مطابق ہونا اور ظن سے مراد نفس الامر کے خلاف ہونا ہے۔

احادیث اور قرآن کے بارے میں جو یقینی اور ظنی ہونے کی بحث ہو رہی ہے وہ ثبوت کے اعتبار سے ہے نہ مضمون کے نفس الامر کے موافق یا مخالف ہونے کے بارے میں کیونکہ اس بحث (مضمون کی صداقت و عدم صداقت) کا تعلق اس بات سے ہے کہ دینی حدیثیں بھی بذریعہ وحی آتی ہیں یا نہیں۔ اگر بذریعہ وحی نہیں آتی تو جب اللہ کی طرف سے ان کی تردید نہیں ہوئی تو کیا حکم وحی ہے یا نہیں۔ حدیثوں کو ماننے والے تو اکثر دینی احادیث کو بذریعہ وحی مانتے ہیں اور جو حدیثیں اجتہادی ہیں بوجہ عدم تردید ان کو وحی کے حکم میں مانتے ہیں۔ پس اس صورت میں مضمون کی صداقت کے اعتبار سے قرآن اور دینی حدیثوں کا مرتبہ برابر ہے اور یہ بحث دلالت کے اعتبار سے بھی نہیں کیونکہ اس اعتبار سے بھی قرآن و حدیث ظنیت اور یقین میں برابر ہیں اور اس آیت مذکورہ کا تعلق ثبوت کے بارے میں نہیں لہٰذا اس میں آیت کا پیش کرنا بے محل ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

★ اس امر پر کہ دین یقینی ہوتا ہے نہ ظنی دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ هُوَ الْحَقُّ (جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کی ہے وہ بالکل حق ہے۔

اس آیت میں بھی مضمون کی صداقت زیر بحث ہے بلکہ کتاب کا من جانب اللہ ہونا مراد ہے۔ نہ ثبوت وعدم ثبوت یا ثبوت کے اعتبار سے ظن ویقین ہونا۔ اور مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ قرآن باعتبار ثبوت کے یقینی ہے۔ اور آیت میں اس کا ذکر نہیں لہٰذا یہ آیت موضوع بحث سے غیر متعلق ہوگی۔

★ تیسری دلیل یہ ذکر کرتے ہیں:

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (اس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ سراسر حق ہے یعنی یقینی ہے ظنی وقیاسی نہیں الخ۔

اس آیت کا تعلق بھی مضمون کے نفس الامر کے مطابق ہونے کے ساتھ ہے نہ ثبوت کے اعتبار سے اور بحث ثبوت کے متعلق تھی اور مضمون کے اعتبار سے قرآن اور دینی حدیثیں دونوں برابر ہیں یعنی یقینی ہیں یا ظنی ہیں۔

پھر اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اس میں شبہ نہیں کہ قرآن خود کہتا ہے کہ:

اِنَّهُمْ لَفِیْ شَکٍّ مُّرِیْبٍ یقیناً وہ سخت شک میں ہیں۔

اگر آیت کا یہ مطلب ہو کہ قرآن میں کسی کو شبہ نہیں تو اس صورت میں لازم آتا ہے کہ کافر وہی ہوگا جو معاند ہو یعنی دل سے مانتا ہو مگر زبان سے انکار کرتا ہو حالانکہ قرآن جابجا یہ کہتا ہے کہ کافر شک میں ہیں۔

بَلْ هُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ یہ لوگ اپنے شک میں پھر رہے ہیں۔

ہاں آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کی صداقت پر ایسے دلائل موجود ہیں کہ اگر کوئی شخص صحیح طور پر ضد وہٹ دھرمی کو چھوڑ دے تو اس کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر یقین ہو جاتا ہے۔ پس گویا کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ معنے اس امر کے منافی نہیں کہ کسی کو اس میں شک ہو۔

● یہ دلائل تھے قرآن کے یقینی ہونے کے۔ اب اس کے بعد جو منکرین حدیث نے قرآن کے محفوظ ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ بھی سنیے چنانچہ لکھتے ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا

© rasailojaraid.com